https://telegram.me/ilmokitab

سرور صاحب میری نظر میں

کچھ ایسے بزرگ ہیں جن کا نہ صرف میں گہرا احترام کرتا ہوں بلکہ اردو کے معاملات میں ان کی رہبری بھی قبول کرتا ہوں۔ ان میں جناب مالک رام اور پنڈت آنند نرائن مُلّا کے ساتھ ساتھ اردو کے سب سے سینئر پروفیسر آلِ احمد سرور بھی شامل ہیں۔ میری بیعت کسی گروپ بندی کے تحت نہیں، یہ اس سے ظاہر ہے کہ یہ اصحابِ ثلاثہ کسی طرح ہم صفیر و ہم نوا نہیں گردانے جا سکتے۔ ادب کے نظریے کا معاملہ ہو کہ فن کا، اردو تعلیم کی بات ہو کہ اردو سیاست کی، میں آنکھ موند کر سرور صاحب کی قیادت پر بھروسا کر سکتا ہوں، یہ بھروسا کہ وہ کبھی مجھے گمراہ نہیں کر سکتے، چرکا نہیں دے سکتے۔ وہ ایسے مقتدا ہیں جو میرے غیر متزلزل بہی خواہ رہے ہیں۔ میں بساطِ ادب کا اک ٹٹ پونجیا ہوں اس کے باوصف وہ میرے بارے میں کیوں وقیع رائے رکھتے ہیں؟ اسے دکانِ بے رونق کی خریداری کے سوا کیا کہا جائے...!

۱۹۶۵ء میں جموں یونی ورسٹی کی اردو پروفیسری کے لیے سلیکشن کمیٹی ہوئی۔ میں امیدوار تھا لیکن غیر حاضر تھا۔ سرور صاحب نے میرے حق میں سفارش کی جب کہ دوسرے ماہر صاحب کو تامّل تھا۔ سرور صاحب کی رائے کو اہمیت دے کر اس ننگِ اساتذہ کو منتخب کر لیا گیا۔ اسی طرح ۷۲۔۱۹۷۱ء میں جامعہ ملّیہ اسلامیہ نئی دلّی میں اردو پروفیسری کے لیے کمیٹی ہوئی۔ میرے ایک کرم فرما نے نامعلوم اسباب کی بِنا پر مجھے اس منصب کے لیے مناسب نہ سمجھا۔ سرور صاحب میری تائید میں مورچہ سنبھالے رہے، کوئی فیصلہ نہ ہو سکا لیکن سرور صاحب نے میرا

من تو جیت لیا۔ انجمنِ ترقّیِ اردو ہند ہو کہ کوئی دوسرا ادارہ، میں ہمیشہ کمیٹیوں کی رکنیت سے پیچھے ہٹتا گیا اور وہ اصرار کر کے مجھ پر ابرِ کرم برسایا کیے۔ ۱۹۶۹ء میں فراؔق صاحب نے مجھ سے کہا، ''آلِ احمد سرور سے بچ کر رہنا''۔ میں نے کہا کہ مجھے تو ان سے کوئی کھٹکا محسوس نہیں ہوتا۔ اس سخن ور نے کہا، ''میرا یہ مطلب نہیں کہ وہ آپ کے گھر میں نقیب لگالے گا، اس سے احتیاط برتنا'' میں نے احتیاط کو پرے رکھا اور میں سرور صاحب کی طرف سے کسی خسارے میں نہیں رہا۔

سرور صاحب کو میں نے پہلی بار کب دیکھا، اس کے بارے میں بچپن کا دھندلا سا تاثر ہے۔ میں ۱۹۳۹ سے ۴۱ء تک گورنمنٹ کالج مراد آباد میں پڑھتا تھا اور ہوسٹل میں رہتا تھا۔ سرور صاحب اس زمانے میں رضا انٹر کالج رام پور کے پرنسپل رہے ہوں گے۔ ایک دن سنا کہ ہمارے اردو کے استاد فاروقی صاحب (اب تو ان کا پورا نام بھی یاد نہیں) کی دعوت پر آلِ احمد سرور ہمارے کالج میں تشریف لا رہے ہیں۔ میں نے انھیں کالج کے احاطے میں عمارت کی طرف جاتے دیکھا، اس طرح کہ وہ اور فاروقی صاحب ہوسٹل کے سامنے کی سڑک پر سے پیدل گزر رہے ہیں۔ سرور صاحب نے ٹوپی اور شیروانی زیبِ فرق و برکر رکھی ہے، گلے میں گوٹے کا ہار پڑا ہے۔ کالج میں جاکر ان کا کیا ہوا مجھے معلوم نہیں کیوں کہ انھوں نے طلبہ کو خطاب نہیں کیا۔ کالج میں یہ روایت تھی ہی نہیں، چناں چہ میں نے کبھی نہیں دیکھا کہ باہر سے کسی نے کالج میں آکر طلبہ کو مخاطب کیا ہو۔ میرے ذہن میں اس ہار پوش شخص کے جو مبہم نقوش ہیں ان کے مطابق اس کی اور سرور صاحب کی ہیئت میں کوئی مناسبت نہیں، واللہ اعلم وہ سرور صاحب ہی تھے یا میرا بوسیدہ حافظہ دھوکا دے رہا ہے۔

سرور صاحب پہلے مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ میں لیکچرر تھے۔ وہاں سے چھوڑ کر رضا انٹر کالج رام پور کے پرنسپل ہو کر چلے گئے۔ میں ان کی اس ترجیح سے مطلق خوش نہیں۔ انھوں نے معلمی پر اقتدار کو ترجیح دی۔ اردو ادبیات کی تعلیم سے کنارہ کش ہو کر انتظامیہ میں چلے گئے، اچھا نہیں کیا۔ ڈاکٹر زور کی غلطی اس سے بھی مضاعف ہے۔ انھوں نے عثمانیہ یونی ورسٹی کی اردو پروفیسری کو ٹھکرا کر چادر گھاٹ کالج کی پرنسپلی پسند کی۔ بعد میں کالج سے ڈگری جماعتوں کا سقوط ہوگیا اور حیدر آباد کے بقیہ قیام میں زور صاحب پرنسپل چادر گھاٹ انٹر کالج رہے۔ سرور صاحب کچھ ہی سال بعد لکھنؤ یونی ورسٹی میں ریڈر ہو گئے۔ ان کا انتخاب قدرے متنازع فیہ تھا۔ انھیں مقامی امیدوار احتشام حسین پر ترجیح دی گئی۔ ماہر سلیکشن مولوی عبدالحق تھے۔ ایک زمانے میں لکھنؤ یونی ورسٹی کے شعبۂ اردو فارسی میں ادب کے کیسے کیسے آفتاب و ماہتاب جمع ہوگئے تھے۔

۵۳-۱۹۵۲ء میں وہاں بہ یک وقت مسعود حسن رضوی، سرور صاحب، احتشام صاحب، ڈاکٹر نذیر احمد، ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی اور ڈاکٹر محمد حسن موجود تھے۔ ان سب کے اجتماع نے شعبے کو بکر ماجیت کے نورتنوں کی سبھا بنا دیا ہوگا۔ آخرش مسعود صاحب ریٹائر ہو گئے۔ نورالحسن ہاشمی آخر تک ڈٹے رہے بقیہ سب کو اس بدبخت شعبے نے ایک ایک کر کے کھو دیا۔ اربابِ حل وعقد کی کیسی کوتاہ بینی تھی کہ مسعود صاحب کے بعد سرور صاحب کو پروفیسر نہ بنایا۔ وہ علی گڑھ سدھار گئے۔ احتشام صاحب کو ریڈری پر ہی مصلوب رکھا۔ انھیں الٰہ آباد نے بلا لیا۔ کسی شعبے کو بنانا کتنا مشکل ہوتا ہے، بگاڑنا کتنا آسان۔ خداوندانِ لکھنؤ یونی ورسٹی نے آخر الذکر کام کتنی نرم دستی سے سرانجام دیا۔

۱۹۵۶ء کے قریب میں نے مثنوی پر ڈی لٹ کے لیے ریسرچ شروع کی۔ لکھنؤ میں نعمت اللہ روڈ پر سرور صاحب کی بڑی سی کوٹھی تھی۔ میں وہاں ان سے ملا۔ انھوں نے مجھ سے کہا کہ ہمارا ریسرچ کا تصور قینچی اور گوند کا نہیں، میں یہ سن کر سٹپٹایا، مرعوب ہوا۔ اس وقت ان میں اور مجھ میں بہت فرق تھا، اب کم ہو گیا ہے۔ وہ مجھ سے عمر میں گیارہ بارہ سال بڑے ہیں، علم میں بہت زیادہ فرق ہے۔ پانچ سال اور سترہ سال کے اشخاص میں عمروں کا یہ فرق بہت نمایاں دکھائی دیتا ہے۔ ۵۸ اور ۷۰ سال کے ہونے پر دونوں ایک ہی نسل کے معلوم ہونے لگتے ہیں۔ وقت کے بہنے کے ساتھ ساتھ میں ان کے پاس ہوتا گیا۔ حمیدیہ کالج بھوپال اور وکرم یونی ورسٹی اجین میں ایم اے اردو کی ذمہ داری سنبھالنے کے بعد مجھے ان سے ملنے جلنے کا زیادہ موقع ملا۔ وہ بارہا بھوپال میں میرے ظلمت کدے میں مہمان رہے ہیں اور میں کئی بار علی گڑھ میں ان کے دارالسرور میں ٹھہرا ہوں؟ شبانہ روز ان کی علمی صحبت سے اکتساب کیا ہے۔

سرور صاحب کی جمالیاتی حس کا تذکرہ سننے میں آیا ہے۔ رشید احمد صدیقی نے ان سے گلاب کے پودے لانے کو کہا تھا۔ وہ نہ لائے اور یہ فقرہ تراش دیا کہ مجھے گل رُخوں کے مشاہدے ہی سے فرصت نہ ملی۔ رشید صاحب نے اس چرب زبانی کے صدقے میں ان کی معذرت قبول کر لی۔ علی گڑھ میں سرور صاحب کو یونی ورسٹی کا جو مکان ملا ہوا تھا وہ ایک وسیع کوٹھی تھی۔ اس میں سامنے کی طرف ایک بہت بڑا کمپاؤنڈ تھا جو نگہداشت کے بغیر بیہڑ پڑا ہوا تھا۔ جگہ جگہ سوکھی لمبی گھاس اُگی تھی۔ کسی نے سبزۂ بیگانہ کی بیخ کنی نہ کی تھی۔ میں کہ ازلی باغبان ہوں، اسے دیکھ کر حسرت سے ہاتھ ملنے لگا۔ کیا ہوا ان کا وہ جمالیاتی ذوق! اس صحن میں گل کاری کی جاتی تو کیا چہچہاتا اور ڈہڈہاتا خانہ باغ ابھرتا۔ عمارت کا رنگ روپ نکل آتا۔

یاد پڑتا ہے کہ کنہیا لال کپور نے اپنے کسی مضمون میں اردو پروفیسر کا ذکر کیا ہے اور

اس کے لیے جو نمائندہ نام لیا ہے وہ آل احمد سرور کا ہے۔ کوئی تو بات ہے کہ ہم اردو پروفیسر کا ذکر کریں تو سب سے پہلے جو شخصیت ہمارے ذہن میں ابھرے وہ سرور صاحب بالقابہ کی ہو۔ میری نظر میں اردو کے پروفیسروں کے دو طبقات ہیں، ایک کلاسیکی مشرقی انداز کے عالم پروفیسر جیسے مسعود حسن رضوی اور رشید احمد صدیقی۔ دوسرے وہ جدید پروفیسر جو موجودہ دور کے تقاضے پورا کرتا ہے اور دوسرے مضامین کے شرفا کی بزم میں بھی لب کشائی کرسکتا ہے۔ وہ جدید علوم اور مغربی ادبیات سے کچھ نہ کچھ واقفیت رکھتا ہے۔ ایسے روشن دماغ پروفیسروں کے بہترین نمائندے سرور صاحب اور احتشام مرحوم ہیں۔ ان کے بعد بھی دو چار کام کے پروفیسر ہوئے ہیں، ورنہ بیش تر کی یہ حالت ہے:

ہیں مئے ناب کے دلّال، قدح خوار نہیں

اس جوڑی میں سے سرور صاحب بچے ہیں۔ ان کے ہوتے دوسرا نظر میں نہیں جچتا۔ کہنا پڑتا ہے:

بسیار خوباں دیدہ ام لیکن تو چیزے دیگری

اور دوسروں کی ناقدری نہ بھی کروں تو بھی کہوں گا:

عالم میں تجھ سے لاکھ سہی، تُو مگر کہاں!

ان میں کمال کی خوبی یہ ہے کہ کسی میدان میں بند نہیں، ہر باب میں سرخ رو ہوتے ہیں۔ وہ کلاس میں پڑھاتے ہیں تو طلبہ کو کیا کیا نکتے، خبر اور نظر کی کیا کیا دولت دیتے ہیں۔ تحریر میں ان کا خاص میدان تنقید ہے جو اپنے حسنِ انشا کے سبب تخلیق کی طرف فرار کرنے کو بے چین رہتی ہے۔ وہ بدایوں کے رہنے والے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ وہاں کے استادانِ فن پرانی دستاویز تیار کر دیتے تھے، ایسا جعلی کاغذ جو جدید ہوتے ہوئے بھی قدیم معلوم ہو۔ اس نسبت سے سرور صاحب کو مخطوطہ شناس یا کم از کم مخطوطہ باز محقق ہونا چاہیے تھا لیکن انھوں نے اپنے لیے تنقید کی وادی پسند کی۔ ان کی تنقید محض لفظوں کی بازی گری نہیں ہوتی، اسے پڑھ کر معلوم ہوتا ہے کہ زیرِ بحث موضوع کے بارے میں ہمیں اس پہلو کا احساس نہ تھا۔ ان کے تجزیے پر آمنّا و صدقنا کہتے ہی بنتی ہے۔ یہ جو مشہور ہے کہ سرور صاحب کی تنقید کا انداز یہ ہے کہ یوں بھی ٹھیک ہے اور ووں بھی ٹھیک، مجھے اس پھبتی سے اتفاق نہیں۔ ان کی تنقید میں تجزیے اور تفہیم کا بھرپور سرمایہ ہوتا ہے اور تنقید کے ساتھ ساتھ ان کے تخلیق کے سوتے بھی بند نہیں۔ وہ قابلِ ذکر شاعر ہیں۔ ان کا ایک مصرع میرے ذہن پر نقش ہو گیا ہے:

چاند چھو لینے کا قصہ پھول پی جانے کی بات

ان کا تیسرا میدان ادبی محفلیں ہیں۔ احتشام صاحب اپنی اداس سنجیدگی کے باوجود اردو کے اساتذہ میں بہترین مقرر تھے۔ ڈائس پر سرور صاحب کا رنگ دوسرا ہے۔ یہاں آکر وہ جمال پرست معلوم ہوتے ہیں۔ اپنی تقریروں میں جب قرمزی ترکیبیں اور شعریت بیز فقرے لڑھکانے شروع کرتے ہیں تو نثر شعر ہو جاتی ہے اور مشاعروں کی سی داد دینے کو جی چاہتا ہے۔ حسین فقروں کا ذخیرہ لامتناہی معلوم ہوتا ہے، اور یہ نہ سمجھیے کہ ان کا سرمایہ محض پسی ہوئی بجلیاں، مقدس سنجیدگی اور شیریں دیوانگی جیسے فقرے ہی ہیں۔ ان کے یہاں مغز بھی ہوتا ہے۔ کسی سیمینار میں انھیں صدارت کرتے دیکھیے۔ مقالہ نگار علما جب اپنے گاڑھے مقالے سنا چکتے ہیں تو سرور صاحب کے صدارتی مشاہدات ان سے بھی زیادہ معلومات افروز ہوتے ہیں۔ ۱۹۸۰ء کے اواخر یا ۱۹۸۱ء کے اوائل میں ادارہ ادبیاتِ اردو حیدر آباد میں ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے نظیرا کبرآبادی پر ایک دیدہ ورانہ مقالہ پڑھا۔ سرور صاحب صدارت کر رہے تھے۔ انھوں نے جو صدارتی تبصرہ کیا وہ مستقل تقریر کا طول پکڑ گیا، لیکن اسے سن کر معلوم ہوا کہ نظیرا کبرآبادی کو ہم نے آج سمجھا ہے۔

سرور صاحب کا چوتھا وصف یہ ہے کہ وہ کمیٹیوں کے لیے بہترین رکن ہیں۔ کسی قسم کی کمیٹی ہو، سرور صاحب اس کے ارکان میں نمایاں ترین مقام حاصل کرلیں گے۔ ان کے مشاہدات سب سے زیادہ توجہ سے سنے جائیں گے۔ وہ اپنے خیالات اس ڈھنگ سے ادا کریں گے کہ اپنی بیش تر باتیں منوالیں گے۔ اگر کوئی ایسی کمیٹی یا مجلس ہو جس میں اردو والوں کے علاوہ دوسرے موضوعات کے نمائندے بھی ہوں، تو ان سے بہتر اردو کا سفیر نہیں ہوسکتا۔ ملک کے باہر وہ کسی وفد کسی درس گاہ میں جائیں، اغیار کو متاثر کر کے آئیں گے۔ اہلِ اردو ناز سے انھیں پیش کر سکتے ہیں کہ دیکھو اردو کا پروفیسر اس قسم کا ہوتا ہے، وہ گھونچو قسم کا مولوی نہیں ہوتا بلکہ دوسرے مضامین کے اساتذہ کے دوش بدوش چلتا ہے، ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرسکتا ہے۔

اپنے موضوع سے جو رچا ہوا خلوص اگلی نسل کو تھا وہ بعد والوں کو نہیں۔ میں سرور صاحب کے ساتھ کئی بار سلیکشن کمیٹیوں میں بیٹھا ہوں۔ وہ ہر امیدوار سے جس طرح مفصّل بات کرتے ہیں، اس کی پسند کے موضوع پر تبادلۂ خیال کرتے ہیں، وہ انھیں کا حوصلہ ہے۔ مجھے جلدی ہوتی ہے کہ اس شخص کو منتخب تو کیا نہیں جا سکتا، اس پر زیادہ وقت کیوں خراب کیا جائے، لیکن سرور صاحب ہر امیدوار کو مطمئن کر دیتے ہیں کہ اس پر سے سرسری نہیں گزرا گیا۔ خوبی یہ ہے کہ ہر امیدوار سے اس کے خصوصی موضوع پر گفتگو کرتے ہیں تاکہ اسے اپنی معلومات کی نمود

کرنے کا پورا موقع مل سکے۔ اسے کبھی پریشان نہیں کرتے۔ یہی کیفیت ڈگریوں کے زبانی امتحان (وائی وا) میں ہوتی ہے۔

ایک بار جامعہ ملّیہ اسلامیہ میں لیکچرر کا سلیکشن تھا۔ شام کا وقت تھا۔ امیدواروں کی ایک بڑی کھیپ تھی۔ سرور صاحب اور میں ان کو ٹھکانے لگانے کے لیے بلائے گئے۔ شام کی گاڑی سے میرا الٰہ آباد کا ریزرویشن تھا اور وہ اسی گاڑی سے علی گڑھ جانے والے تھے۔ سلیکشن سے پہلے میں نے سرور صاحب کو متنبّہ کیا کہ امیدواروں کی کثرت کے پیشِ نظر ہر شخص کو محض پانچ منٹ دیے جائیں۔ وہ ظاہرا مان گئے لیکن سوالات کرتے وقت بھول گئے اور حسبِ معمول درازنفسی اختیار کی۔ میں بار بار ٹوکتا رہا۔ آخر میں نے وائس چانسلر صاحب سے کہا کہ میں اپنی گاڑی نہیں چھوڑ سکتا، آپ لوگ فیصلہ کر لیجیے، میں چل دوں گا۔ قسمت سے آخر میں کچھ امیدوار ایسے ٹھس اور سپاٹ آگئے کہ ان سے بات کی بات میں نپٹ لیا گیا اور کام پورا ہوگیا۔ سرور صاحب اور میں لشٹم پشتم ریل پر پہنچے لیکن اس طرح کہ گاڑی چھوٹنے کو تھی، مجھے اپنی محفوظ سیٹ ہاتھ نہ آئی، جلدی سے کہیں بیٹھ گئے۔ بعد میں غازی آباد میں اپنا صحیح ڈبا معلوم کر کے منتقل ہوئے۔ اسی دن سہ پہر میں مکتبۂ جامعہ کے جنرل مینجر شاہد علی خاں نے مجھے کیفی کا مجموعہ ''آوارہ سجدے'' اور جاں نثار اختر کا مجموعہ ''خاکِ دل'' مفت تفویض کیا تھا۔ میں یہ دو کتابیں ہاتھ میں لیے تھا۔ بوکھلاہٹ میں غازی آباد میں جو ڈبا تبدیل کیا، وہ دونوں کتابیں وہیں چھوٹ گئیں۔ صبح تڑکے فتح پور میں پہلے والے ڈبے میں جا کر دیکھا لیکن وہاں کتابوں کا پتا نہ تھا۔ کوئی صاحبِ ذوق یا کور ذوق انھیں لے اڑا تھا۔ مالِ مفت دلِ بے رحم، یا مفت را چہ گفت، کتابیں گئیں تو گئیں سلیکشن کا حق تو ادا ہوگیا۔ چوں کہ اکثر انتخابات میں بیش تر امیدواروں کے بارے میں اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے نام پر غور نہیں کرنا، میں ان پر وقت ضائع نہیں کرنا چاہتا لیکن سرور صاحب کا اصول ہے کہ ہم جس کام کے لیے آئے ہیں اس کا حق ادا کرنا چاہیے۔

اس کے برعکس میرا وتیرہ ملاحظہ ہو، ایک بار میسور یونی ورسٹی میں پروفیسر کی پوسٹ کا سلیکشن تھا۔ رفعیہ سلطانہ اور یہ ناکس و ناچیز منتخب کار تھے۔ غالباً چار بجے سلیکشن شروع ہوا۔ قائم مقام وائس چانسلر نے بتایا کہ اسے پانچ بجے کسی دوسری میٹنگ میں جانا ہے۔ میں نے وعدہ کیا کہ اتنی دیر میں سب امیدواروں کو ٹھکانے لگا دیں گے۔ آٹھ دس رہے ہوں گے۔ آخری امیدوار خالصہ کالج دلّی کے شہاب جعفری تھے۔ بوجوہ یہ صاف تھا کہ یونی ورسٹی پروفیسر کی جائداد ان کے نام ہبہ نہیں کی جاسکتی۔ میں نے ان سے ان کی لامتناہی ریسرچ کے بارے میں گفتگو کر

کے بابِ سخن بند کر دیا۔ وہ کہا کیے کہ مجھ سے کچھ تو پوچھیے۔ میں نے نیاز مندی دکھائی کہ ہم آپ کو اچھی طرح جانتے ہیں آپ سے سوال نہ کریں گے۔ وہ مُصر رہے لیکن ہم نے بساط تہ کر دی اور کسی کو منتخب نہیں کیا۔ سرور صاحب ہوتے تو میں یوں گھاس نہ کاٹ سکتا تھا۔ میں سوچتا ہوں کہ جب پہلے سے فیصلے کا کم وبیش اندازہ ہوتا ہے تو ڈرامے کو طول دینے سے کیا فائدہ۔ سرور صاحب کو امیدوار کی اور اپنی تشفّی عزیز ہے۔

میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ سرور صاحب کمیٹیوں کے لیے بہترین آدمی ہیں، یہ ان کی طاقت بھی ہے کم زوری بھی۔ اردو کی ہر اعلیٰ کمیٹی، اکیڈمی، بورڈ وغیرہ کے لیے ان کے نام کی یاد آتی ہے کیوں کہ کمیٹی کے کام میں ان سے جو رہنمائی اور مدد ملتی ہے، وہ دوسروں سے کم ملتی ہے۔ ایک بار ڈاکٹر ذاکر حسین نے مالک رام صاحب سے کسی کام کو کہا۔ مالک رام راوی ہیں کہ انھوں نے ذاکر صاحب سے کہا کہ ذرا سرور صاحب سے پوچھ لوں۔ اس پر ذاکر صاحب بھڑک گئے اور کہنے لگے، ''کیا بات ہے اردو والوں کا کوئی کام سرور صاحب اور احتشام صاحب کے بغیر نہیں ہوتا۔'' جواب صاف ہے کہ یہ ان دونوں کی صلاحیتوں کے باعث تھا۔ ہر جہت سے اتنی زیادہ مانگ سے نقصان یہ ہوا کہ سرور صاحب نے خود کو ہر معاملے میں پھنسا لیا۔ انسان کا وقت اور ذہنی قویٰ محدود ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ وہ جتنا ہضم کر پاتے ہیں اس سے زیادہ چبا لیتے ہیں اور جتنا چبا سکتے ہیں اس سے زیادہ کتر لیتے ہیں۔ وہ اتنی ذمہ داریاں قبول کر لیتے ہیں کہ ان کو پورا نہیں کر سکتے۔ ان پر ہمیشہ کاموں کا بقیہ واجب رہتا ہے۔ غالبؔ نے کہا:

ہوس کو ہے نشاطِ کار کیا کیا

لیکن ان کی ہوس کو نشاطِ تکمیلِ کار کا منھ دیکھنا شاذ ہی ملتا ہوگا۔ اب تو وہ ممتحنی چھوڑ چکے ہیں لیکن جس زمانے میں یہ کام کرتے تھے تو یہ ہوتا تھا کہ کسی یونی ورسٹی میں سب کی کاپیاں جنچ کر آگئی ہیں صرف سرور صاحب کی کاپیاں باقی ہیں۔ تقاضے پر تقاضے جا رہے ہیں، تار کھٹکائے جا رہے ہیں، مگر اُدھر سے صدائے برنخاست، نتیجہ رکا پڑا ہے۔

سرور صاحب نال متولیات کے بادشاہ نہیں شہنشاہ ہیں۔ اگر کسی کا پی ایچ ڈی کا مقالہ سرور صاحب کے پاس پہنچ گیا تو وہ نصف صدی کے لیے ضبط ہو گیا۔ کب سرور صاحب کو فرصت ہوگی اور کب وہ رپورٹ بھیجیں گے۔ امیدوار ان کی زلف سر ہونے تک جیتا بھی رہے گا کہ نہیں۔ سنا ہے ان کے انتظار خانے کے بعض مقیموں نے اپنی جانِ شیریں جان آفریں کے سپرد کر دی۔ مقالے کی رپورٹ تو بڑی چیز ہے، انھیں تو چٹھیوں کے جواب دینے کی فرصت بھی نہیں ملتی۔

غالب صدی کے زمانے میں، میں نے مدیرِ ''نقوش'' کو لکھا کہ غالب کے خودنوشت مخطوطات سے متعلق ہماری زبان کے جملہ مضامین اور مراسلے ''نقوش'' میں دائجسٹ کر لیجیے اور سرور صاحب کو لکھ کر ان کے تراشے منگا لیجیے۔ ۶؍جنوری ۱۹۷۱ء کے خط میں طفیل صاحب نے مجھے لکھا:

> اگر بحث کے جملہ شمارے مجھے مل جائیں تو ان کی اشاعت کے بارے میں سوچ سکتا ہوں، مگر جن کا نام آلِ احمد سرور ہے، وہ اللہ میاں کی بات سنتے ہوں تو سنتے ہوں، میری تو مطلق نہیں سنتے۔

اب میری چٹھیوں کا تو جواب مل جاتا ہے، پہلے ایسا نہ تھا۔ گوناگوں مصروفیات کے باعث وہ کس کام کو پورا کر پاتے ہیں؟ ان کے نامۂ اعمال میں نامکمل کاموں کا ایک طومار بندھا ہے۔ شروع میں وہ علی گڑھ گئے تو امریکا کے کسی شاہ برنج کی طرف سے انھیں ایک منصوبے کے تحت ریسرچ پروفیسر رکھا گیا جس میں شاید غالب کے کلام کا انگریزی ترجمہ کرنا تھا۔ وہ کام منصۂ شہود پر نہیں آیا۔ رشید صاحب کی صدارتِ شعبہ ہی کے زمانے میں یونی ورسٹی گرانٹس کمیشن سے تاریخِ ادبِ اردو کا منصوبہ ملا، رشید صاحب سبک دوش ہو کر یہ میراث سرور صاحب کو تفویض کر گئے۔ رشید صاحب نے مجنوں گورکھ پوری کو اسسٹنٹ ڈائریکٹر بنا کر بلا لیا۔ سبحان اللہ کیا انتخاب تھا! علی گڑھ کے شعبۂ اردو کی بزرگی مسلّم، لیکن کہاں تاریخ ادب اور کہاں رشید صاحب،☆ سرور صاحب اور مجنوں صاحب۔ یہ لوگ ادیب ہیں، مؤرخِ ادب نہیں۔ ثمرہ یہ ہوا کہ اس تاریخ کا ناقص اور پُراز اغلاط رہ جانا سرور صاحب کے دامن پر سب سے بڑا دھبّا بن کے رہ گیا۔

علی گڑھ سے سبک دوشی کے بعد شملے کے انسٹی ٹیوٹ میں بھی سرور صاحب نے کوئی کام کیا ہے لیکن وہ مکمل ہو کر سامنے آئے تو ہم جانیں۔ سرور صاحب مقالے بہت اچھے لکھتے ہیں۔ سیمینار اعلیٰ سے اعلیٰ بپا کر سکتے ہیں، لیکن ایک موضوع پر مستقل کتاب لکھنا ان کے بس کا روگ نہیں۔ ادھر کچھ پہلے مجھ سے اعتراف کرتے تھے کہ اب میں محسوس کرتا ہوں کہ میں نے فضولیات میں بہت وقت گنوایا، ان سب کو چھوڑ کر کوئی ٹھوس کام کرتا تو اچھا ہوتا:

ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

ہمیں تو ان کے بارے میں یہ احساس ہمیشہ سے تھا۔ کتنے موضوعات ہیں جنھیں جس خوبی سے وہ سرانجام دے سکتے ہیں، دوسرا نہیں دے سکتا۔ نقدِ ادب کے کسی پہلو پر یا اردو ادب پر مغربی ادب کے اثرات پر وہ کوئی مستقل کتاب لکھ دیتے تو اس کا جواب نہیں ہو سکتا تھا۔ یہ

☆۔ چپ رہ نہ سکا حضرتِ یزداں میں بھی اقبال ۔۔۔ کرتا کوئی اس بندۂ گستاخ کا منھ بند

سب کہنے کے باوجود ان کے مضامین کی غیر معمولی افادیت سے مجھے انکار نہیں، لیکن اگر وہ انھیں موضوعات پر مستقل کتاب لکھتے تو وہ سونے سے بڑھ کر کندن ہوتی۔

کتنے ادارے ہیں جن کے بارے میں سرور صاحب کے نام کے بغیر سوچا بھی نہیں جاسکتا۔ عرصۂ دراز تک وہ انجمنِ ترقیِ اردو ہند کے جنرل سیکریٹری رہے۔ ''ہماری زبان'' کو انھوں نے ایک زندہ پرچہ بنادیا۔ وہ عبدالحق کی تحقیقی روایت تو برقرار نہ رکھ سکے، کوئی تذکرہ وغیرہ شائع نہیں کیا، رسالہ ''اردو ادب'' کو بھی تحقیق سے ہٹا کر تخلیق کی ڈگر پر لے جانا چاہا، لیکن اپنے مزاج کے مطابق کچھ کیا تو۔ کتابوں کی اشاعت کا معاملہ حلقۂ موج میں کام نہنگ پوشیدہ ہونے کے مترادف ہے۔ کتابت و طباعت کے بھنور سے صحیح و سالم نکلنا ہفت خواں سر کرنا ہے۔ سب پر مستزاد مالیات۔ یہی وجہ ہے کہ انجمن میں بعض مسوّدوں کی اشاعت میں کچھ زیادہ ہی تعویق ہوتی تھی۔ میں نے اپنے ڈی لٹ کے مقالے ''اردو مثنوی شمالی ہند میں'' کا مسوّدہ ۱۹۶۰ء میں انجمن کو دے دیا۔ بعد تقاضائے بسیار ۱۹۶۹ میں شائع ہوا لیکن دوسرے اڈیشن کے لیے ترمیم شدہ مسوّدہ انجمن میں ۱۹۷۵ء یا ۷۶ء میں گیا، شائع ہوا ۱۹۸۷ء میں۔ سرور صاحب کا نہیں اس مقالے ہی کا قصور ہوگا۔

انجمن نے منشی مہیش پرشاد کے انتقال کے بعد ان کے کاغذات خریدے تھے۔ انھیں میں ان کی مرتبہ ''خطوط غالب'' جلد دوم کا مسوّدہ تھا۔ انجمن، مالک رام کی مدد سے اسے شائع کرنا چاہتی تھی۔ ڈاکٹر ذاکر حسین نے مالک رام سے کہا کہ انھیں یہ مسوّدہ دکھائیں۔ وہ سرور صاحب کے پاس تھا۔ ان سے دو چار دفعہ مانگا گیا۔ وہ کہتے رہے کہ گھر میں کہیں رکھا ہے، تلاش کرکے بھیج دوں گا۔ اس پر ڈاکٹر ذاکر حسین نے مالک رام صاحب سے کہا ''جب یہ (سرور صاحب) مریں گے، ان کے گھر سے کئی مسوّدے برآمد ہوں گے۔''

جب سرور صاحب انجمن سے الگ ہوئے تو مجھے ایک خط میں لکھا کہ انھیں انجمن کی خدمات کے صلے میں زخم ہی ملے۔

وہ ایک لمبی مدت تک ساہتیہ اکیڈمی کی اردو کمیٹی کے صدر رہے۔ کرشن چندر کو ساہتیہ اکیڈمی کا انعام نہیں ملا۔ اس کے لیے وہ سرور صاحب کو موردِ الزام ٹھہراتے تھے کہ وہ ترقی پسندوں کے دشمن ہیں۔ میں نے عرض کیا کہ راجندر سنگھ بیدی کو تو ایوارڈ دلا چکے ہیں۔ بیدی بھی ایک زمانے میں ترقی پسندوں میں گنے جاتے تھے۔ اس صدی کی پانچویں دہائی میں بیش تر بڑے ادیب ترقی پسند تھے، یا کم از کم ان کے ہم سفر تھے۔ سرور صاحب بھی قیامِ لکھنؤ کے زمانے میں

انجمنِ ترقّی پسند مصنّفین کی بزم آرائی کرتے تھے۔ جگن ناتھ آزاد کہتے تھے کہ میں نے سرور صاحب سے کہا، ''ہم نے آپ ہی سے ترقی پسندی سیکھی تھی، اب آپ ہی اسے چھوڑ دیں تو کیا کیا جائے؟'' سرور صاحب ترقی پسند سے جدیدیے بنے اور اب اقبالیے ہو گئے ہیں۔ پندرھویں صدی ہجری پر سیمینار کراتے ہیں۔ ویسے ان کی اقبال دوستی نئی نہیں ہے۔ کوئی پچیس برس ادھر کی بات ہے، میں نے مسعود حسن رضوی صاحب سے پوچھا کہ اقبال کے اس شعر میں:

تین سو سال سے ہیں ہند کے مے خانے بند
اب مناسب ہے ترا فیض ہو عام اے ساقی

تین سو سال سے کیا مراد ہے؟ وہ نہ بتا سکے اور کہا سرور صاحب سے پوچھیں گے، وہ بڑے اقبالیے ہیں۔ بعد میں مجھے معلوم ہو گیا کہ مجدّد الف ثانی کی طرف اشارہ ہے۔ سرور صاحب کے قدیمی اقبالیے ہونے کی سند مل گئی۔ ان کی جدیدیت کی وجہ سے ترقی پسندان سے کھنچ گئے۔ ایک زمانے میں یہ خبر زوروں میں گرم تھی کہ سرور صاحب کشمیر یونی ورسٹی کے وائس چانسلر ہونے والے ہیں۔ سرور صاحب نے مجھ سے کہا کہ کشمیر کے وزیرِاعلیٰ صادق صاحب ایسا چاہتے تھے لیکن سرور صاحب کے قدیمی دوست سجاد ظہیر مرحوم نے صادق صاحب کو اس کے خلاف مشورہ دیا۔

جس طرح ساہتیہ اکیڈمی پر یہ داغ ہے کہ اس نے کرشن چندر کو کبھی ایوارڈ نہیں دیا، اسی طرح یوپی اردو اکیڈمی پر بھی یہ داغ رہے گا کہ اس نے سرور صاحب کے ایک مجموعۂ مضامین پر تین ہزار کے بجائے صرف دو ہزار کا انعام دیا۔ سرور صاحب کے قلم سے جو تحریر، بالخصوص تنقیدی تحریر نکلے گی وہ قدرِ اوّل کی ہوگی۔ اس پر انعام دینا ہے تو سب سے بڑا دیجیے ورنہ کچھ نہ دیجیے۔ آنند نرائن مُلّا نے سرور صاحب کی انجمن کی جنرل سکریٹری شپ کی تجدید نہیں کی لیکن جہاں تک مجھے بھنک پڑی ہے، ۱۹۷۴ء میں سرور صاحب کو ساہتیہ اکیڈمی کا اعزاز دینے میں مُلّا صاحب کا بھی دخل تھا۔

زیرکوں نے ارشاد کیا ہے کہ کام کرنے میں سو عیب ہیں نہ کرنے میں ایک عیب۔ سرور صاحب دنیا بھر کے اداروں سے وابستہ رہے، ڈھیر سے لوگوں کو ناآسودہ کیا، دشمنوں کے پرے کے پرے کھڑے کر لیے۔ کہتے ہیں کہ ہر شخص اپنے دوستوں سے پہچانا جاتا ہے۔ کیوں صاحب اگر یہ کہیں کہ ہر شخص اپنے دشمنوں سے پہچانا جاتا ہے، تو کیسا رہے؟ سرور صاحب کے دشمنوں کی صف پر نظر ڈالیے عُظما کا نگار خانہ ہے۔ اردو کے کیسے کیسے جغادری شاعر، نقّاد، محقّق، خادمِ اردو دکھائی دیتے ہیں۔ اس شخص میں کوئی تو بات ہے کہ مخالفوں میں اتنے بڑے بڑے

عمائدِ ادب ہیں۔ میں اگر چاہوں کہ ایسے بقراطوں کو اپنا مخالف بنالوں تو نہیں بنا سکتا کیوں کہ ہاتھی مینڈک کو خاطر میں نہیں لاتا۔ کیفیت و کمیت دونوں میں سرور صاحب کے معاندوں کا معیار و مقدار دیکھ کر رشک ہوتا ہے۔ شگفتہ تنقید لکھنے اور چہکتے بولتے سیمینار کرانے کے ساتھ ساتھ سرور صاحب دشمن بنانے کے فن میں بھی طاق دکھائی دیتے ہیں۔ وہ اپنے دیوان خانے کے گل دستوں کو زخموں کے گلابوں سے سنوارتے ہوں گے۔

میں سرور صاحب کا معترف اور معتقد ہوں۔ مجھے اُن کی نگارش، اُن کی انشا، اُن کا تجزیہ وتقریر، اُن کی گفتار و کردار پسند ہیں۔ اگر ان میں کچھ خامیاں ہیں تو مجھے ان کی شخصیت ان خامیوں کے ساتھ عزیز ہے، کیوں کہ اوصاف کی تابانی میں وہ خامیاں ماند پڑ کر منھ چھپاتی پھرتی ہیں۔ پروفیسری میں وہ میرے آدرش ہیں، ایسا آدرش کہ اس جنم میں تو میں ایسا بن نہیں سکتا۔ اور جہاں تک تنقید کا سوال ہے، میں نے اپنے مجموعے ''ذکر و فکر'' کو ان کے نام منسوب کرتے وقت انھیں اپنا مثالی نقّاد قرار دیا۔

(''تحفۃ السرور''، ۱۹۸۵ء، ترمیم کے ساتھ ''پرکھ اور پہچان'')

☆☆☆

26-10-01